ڈپٹی نذیر احمد کا ایک کمیاب اور نظر انداز شدہ ناول۔ایامیٰ
(تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

ڈاکٹر صائمہ ارم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Deputy Nazir Ahmad is one of the leading and most important novelists of Urdu .His work has many folds and its critical appreciation can lead the reader to the understanding of the muslim society of his time,and no doubt his time was the most important period of social change.Ayama is Nazir's best but most ignored novel.This artical deals with a critical appreciation and research of the novel,rediscovering its importance.In short this novel proves that Nazir Ahmad was a social critic far more than a mere pre planned reformer.

اُردو کی ادبی دُنیا میں ۲۰۱۲ء کو، سال پیدائش کی مناسبت سے منٹو اور میرا جی کے نام کیا گیا۔لیکن منٹو شناسی اور میرا فہمی کے غلغلے میں ڈپٹی نذیر احمد کا بگل کچھ زیادہ شد و مد سے نہ بجایا جا سکا، حالانکہ ۲۰۱۲ء میں جہاں منٹو اور میرا جی کی پیدائش کو سو سال پورے ہوتے ہیں وہیں نذیر احمد کے انتقال کو بھی ایک صدی کا عرصہ مکمل ہو جاتا ہے۔منٹو، میرا جی اور نذیر احمد میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ تینوں اپنے اپنے محیط عمل میں اولیت کا تاج پہنے بغیر، نہایت اہم اور حساس سماجی ناقد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ان تینوں نے اپنے مشاہدے اور حساس دور بینی کو تخلیقی اور فنکارانہ اپج کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ ادبی تاریخ میں ان کا تذکرہ ایک لازمی امر ہے۔نذیر احمد سے پہلے اردو ناول کے آثار تلاش کیے جا سکتے ہیں، منٹو سے پہلے اردو افسانہ موضوع اور بنت کے اعتبار سے با ثروت ہو چکا تھا اور میرا جی سے پہلے اردو نظم ممکنہ امکانات کو برت چکی تھی لیکن فرد کی داخلی نفسیاتی کشمکش اور خارجی معاشرتی روابط کی جدلیاتی کیفیت کو منٹو، میرا جی اور نذیر احمد نے پورے طور پر نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنے انداز میں بیان بھی کر دیا۔

نذیر احمد کی ناول نگاری کا آغاز مراۃ العروس (۱۸۶۹) سے ہوتا ہے۔پھر بنات النعش (۱۸۷۲)، توبتہ النصوح (۱۸۷۴)، فسانہ مبتلا (محصنات۔۱۸۸۵)، ابن الوقت (۱۸۸۸)، اور ایامیٰ (۱۸۹۱) سے ہوتا ہوا رویائے صادقہ (۱۸۹۴) پہ اختتام پذیر ہوا۔حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ایامیٰ، جو نذیر احمد کا ایک اہم ناول ہے، کو عموماً نظر انداز کیا جاتا رہا۔ڈاکٹر سلیم اختر کے

مرتب کردہ 'مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد' میں بھی ناول شامل نہیں ہے۔[۱] اب تک کی اطلاعات کے مطابق ایامیٰ کو ۱۸۹۱ء کے بعد اشاعت نصیب تو ہوئی لیکن اس کا زیادہ چرچا نہ ہو سکا۔ یہ ضرور ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد پر بنیادی اور نہایت اہم تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والے افتخار احمد صدیقی نے ایامیٰ پر سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ نذیر احمد کے تقریباً تمام اہم ناقدین کے ہاں ایامیٰ کا ذکر ملتا ہے لیکن افتخار احمد صدیقی نے بھی ایامیٰ کا سنہء اشاعت نہیں دیا۔ اس ناول کا جو نسخہ ان کے زیر مطالعہ رہا اس کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔ ''ایامیٰ، دلی پرنٹنگ ورکس دہلی، طبع چہارم''[۲] اس حوالے سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ ایامیٰ کی کئی اشاعتیں یا کم سے کم چار اشاعتیں تو ضرور ہوئیں لیکن سنہ کا تعین اس سے بھی نہیں ہوتا۔ پاکستان کے اکثر و بیشتر اہم سرکاری اور ذاتی کتب خانوں میں بھی اس کتاب کا کوئی ایسا نسخہ دستیاب نہیں جس سے اس ناول کی کسی حالیہ اشاعت کا اندازہ ہو سکے۔ تقریباً یہی صورتحال سرحد پار بھی رہی ہے۔ حال ہی میں دہلی سے محترمہ سفینہ صاحبہ نے ایامیٰ کا ایک نسخہ مرتب کر کے شایع کیا ہے۔ اس نسخے کی دیباچے میں وہ لکھتی ہیں:

> ''ڈپٹی صاحب کے اکثر ناولوں کی اشاعت میں طباعت سے متعلق ضروری اطلاعات موجود نہیں۔۔۔ کہ کون سا نسخہ کب طبع ہوا۔ عام طور پر طبع اول ۱۸۹۱ء تسلیم کی گئی ہے۔ میری دسترس میں ۱۸۹۱ء کے دو مطبوعہ نسخے تھے جو مختلف مطابع میں شائع کیے گئے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں ایک ایڈیشن نذیر حسین فیضی کے مطبع میں چھاپا گیا۔ اسی سال کا طبع شدہ ایک ایڈیشن میری دسترس میں ہے جو نذیر احمد کے پسر زادے منذر احمد کے جملہ حقوق کے ساتھ دلی پرنٹنگ ورکس سے اور اس کا ٹائیٹل فائن آرٹ لیتھو پریس میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے نسخے بھی دستیاب ہیں جو ناقص الاول ہونے کی وجہ سے تمام ضروری اطلاعات سے محروم تھے۔ ''ایامیٰ'' کے جس نسخے کو میں نے بنیاد بنایا ہے۔۔۔ اس پر جگہ جگہ حواشی درج ہیں۔ متن کی تصحیحات ہیں۔ دو جگہ بشیر الدین احمد کے دستخط ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ بشیر الدین کی تحریر کو اصل ثابت کر سکیں۔۔۔ ''ایامیٰ'' کا آخری ایڈیشن مجلس ترقی ءادب لاہور نے بھی شائع کیا تھا''[۳]

اس بیان میں کئی امور وضاحت طلب ہیں مثلاً ایامیٰ کے آخری سنہ اشاعت کا معاملہ، یا بنیادی نسخے کا واقعتاً بشیر الدین احمد کے زیر مطالعہ رہنا، لیکن ایک بات جو تحقیق سے غلط ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مجلس کی طرف سے ایامیٰ کا کبھی کوئی ایڈیشن شائع نہیں کیا گیا۔ مجلس کی لائبریری میں بھی ایامیٰ کا کوئی نسخہ موجود نہیں اور نہ ان کی فہرست کتب میں ایامیٰ کا کوئی ذکر ہے۔ چونکہ سفینہ صاحبہ کی مرتب کردہ ایامیٰ میں ان کے بنیادی نسخے کا کوئی عکسی متن شامل نہیں اس لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ انھوں نے متن کے لیے کس حد تک اس نسخے پر اکتفا کیا، اور بوجوہ ان کے پیش کردہ دیباچے میں فراہم شدہ اطلاعات کی صحت بہر طور مشکوک ہو جاتی ہے۔ ایامیٰ کے متن میں بھی بیش از بیش اغلاط راہ پا گئی ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ فرہنگ کی پیشکش خاصی عمدہ ہے اور ان کا یہ دعویٰ بھی بہر حال درست ہے کہ ایامیٰ ڈپٹی صاحب کا ایک نایاب ناول ہے جس کی کشش کئی محققین کو سرحد پار جانے پر مجبور کرتی رہی ہے۔

جی سی یونیورسٹی میں وحید قریشی کلیکشن میں ایامیٰ کا ایک نسخہ بہر طور موجود ہے۔[۴] یہ نسخہ بھی سنہء اشاعت کے بارے کوئی خبر نہیں دیتا۔ مطبع شمسی آگرہ میں بشیر الدین کے اہتمام سے چھپا یہ نسخہ ضروری اطلاعات تو کجا، سنہء اشاعت اور دیباچے

سے بھی محروم ہے۔اس نسخے پر ڈپٹی نذیر احمد کا نام ''ڈاکٹر مولوی حافظ محمد نذیر احمد خان صاحب بہادر مرحوم و مغفور'' کے طور پر مندرج ہے،۵ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ناول ڈپٹی صاحب کے انتقال کے بعد یعنی ۱۹۱۲ء کے بعد کسی وقت چھپا۔پھر یہ کہ یہ طبع سوم ہے تو اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایڈیشن ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۵ء کے آس پاس کہیں چھپا ہوگا۔بہر حال یقین سے کہنا مشکل ہے کہ اس نسخے کا حقیقی سنہء اشاعت کیا ہے۔لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ امہات الامہ، اور نذیر احمد کے لیکچرز کی طرح یہ ناول بھی بار بار کی اشاعت سے محروم رہا۔

افتخار احمد صدیقی نے اپنی کتاب میں ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری کے دو ادوار متعین کیے ہیں اور فسانہ ء مبتلا (محصنات)، ابن الوقت، ایامیٰ اور رویائے صادقہ کو دوسرے دور کے ناولوں میں شمار کیا ہے۔۶

یاد رہے کہ ڈپٹی صاحب کا اوّلین ناول ایک مخصوص ذہنی رویے کے تحت منصۂ شہود پر آیا تھا۔یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ انگریز حکمرانوں کے ایماء پر صوبجات شمال و مغرب کے لفٹیننٹ گورنر، سر ولیم میور کی جانب سے ۲۰ اگست ۱۸۶۸ء کو مفید کتابوں کی تالیف پر جو انعامی سلسلہ جاری کیا گیا، بقول حالی [اس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہے گا]۔جنوری ۱۸۸۰ کے دربار آگرہ میں سر ولیم میور نے عطائے انعامات سے پہلے ملک کے آدمیوں کو ایسے قومی ادب کی بنا ڈالنے کا پیغام دیا تھا جو ''اہل ہند کے جدید حالات کا ترجمان ہو''۷

افتخار احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ ''اس عہد کے اصلاحی رجحانات اور تعلیمی تقاضوں کے پیش نظر اپنا پہلا ناول مراۃ العروس لکھ کر انعامی مقابلے کے لیے پیش کیا''۸ اگرچہ نذیر احمد نے مراۃ العروس کے دیباچے میں یہ ظاہر کیا ہے کہ اس کتاب کا ابتدائی حصہ ۱۸۶۶ میں لکھا گیا تھا اور کتاب اس کے ڈیڑھ برس بعد ۱۸۶۸ میں مکمل ہوئی اور اس کتاب کا بنیادی مقصد ان کی بچیوں کو خانگی زندگی کا سلیقہ اور شعور عطا کرنا ہے جبکہ انعامی مقابلے میں شرکت اور بعد ازاں انعام کا حق دار قرار پانا محض اتفاقی امر ہے۔نذیر احمد نے یہ ناول انعامی مقابلے کے لیے لکھا یا اس سے پہلے، امر واقعہ یہ ہے کہ انھیں اس ناول پر انعام ملا۔آیندہ کے دو ناول بنات النعش اور توبتہ النصوح بھی انعامی سلسلے میں شامل ہوئے اور انعام یافتہ ٹھہرے۔یوں ڈپٹی نذیر احمد کی زندگی پر اس انعامی سلسلے کا گہرا اثر مرتب ہونا ایک بدیہی امر ہے۔اب ذرا ایک نظر اس اشتہار کے مندرجات پر بھی ڈال لی جائے جس کے مطابق ''مفید'' کتابوں پر انعام دیا جائے گا۔''مفید'' کی مزید صراحت کرتے ہوئے اشتہار میں کہا گیا۔

> ''۔۔۔انعامات دیے جائیں گے ورنا کولر میں مفید کتابوں کی تیاری پر، جو منظور شدہ انداز و اسلوب کی ہوں اور جن کا تعلق سائنس یا لٹریچر کی کسی بھی صنف سے ہو، ایسی کتاب طبع زاد بھی ہو سکتی ہے اور تالیف و ترجمہ بھی۔الہیات (تھیالوجی) پر کتابیں قبول نہیں کی جائیں گی اور نہ ایسی کتاب جس میں اخلاقیات کے خلاف کوئی بات ہو۔۔۔واحد شرط یہ ہی ہے کہ کتاب کوئی مفید مقصد پورا کرے۔۔۔ہندوستانی خواتین کے لیے مناسب کتابیں خاص طور قبولیت اور انعام کے لائق سمجھی جائیں گی۔''۹

لہٰذا نذیر احمد کے ناول بیش از بیش منظور شدہ خیالات کی ترویج کے لیے لکھے گئے۔مثال کے طور پر مراۃ العروس، بنات النعش اور ایامیٰ عورتوں کی تعلیم اور بیوہ کے نکاح ثانی کو موضوع بناتے ہیں۔ابن الوقت انگریز حکمرانوں کی سرپرستی اور قبولیت کے خیالات کو عام کرتا دکھائی دیتا ہے، توبتہ النصوح عمومی اخلاق و عقائد کی درستی اور نا مناسب تعلیم کے خلاف اعلان

جنگ کا پرچار ہے اور فسانۂ مبتلا کثرت ازدواج کی خامیاں بیان کرتا ہے۔

اپنے مخصوص سماجی تناظر میں ڈپٹی نذیر احمد کو نہایت شد و مد سے مصلح یا ریفارمر کہا اور ثابت کیا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ بھی بحث طلب ہے کہ ڈپٹی صاحب مصلح تھے یا اس سے بڑھ کر سماجی ناقد، یہ سوالات بھی اپنی جگہ موجود رہتے ہیں کہ وہ قومی اصلاحی جذبے سے زیادہ سرشار تھے یا ان کے لاشعور میں کچھ ذاتی منفعت کا بھی خیال تھا۔ جو ناول انھوں نے لکھے، کیا وہ خالصتاً ادبی کارنامے تھے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور کچھ کہنے کے جوش نے ان سے کہانیاں لکھوائیں یا جنوری ۱۸۸۰ء میں مفید کتابوں پر انعامات کے اشتہار نے بقول حالی برقی قوت بن کر ان کی ادبی صلاحیتوں کو بیدار کر دیا۔ جن خیالات کی ترویج وہ ناول میں بطور راوی، دیباچوں میں بطور مصنف اور پسندیدہ کرداروں کے ذریعے کرتے رہے، وہ ان کے اپنے خیالات تھے یا انھیں محض انگریزی دربار سے منظور شدہ خیالات کی ترویج منظور تھی۔

ڈپٹی صاحب کی ناول نگاری کا دوسرا دور انھیں مصلح سے بڑھ کے ایک سماجی ناقد ثابت کرتا ہے اور اس سلسلے میں ایامیٰ بطور خاص اہمیت کا حامل ناول قرار پاتا ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ جب ڈپٹی صاحب انعام یا سماجی رتبے سے بے نیاز ہو کر محض کچھ کہنے کے جوش میں ناول لکھ رہے تھے۔ وہ سرکار کی خدمت سے مستعفی ہو چکے تھے۔ ان کے پاس آخیر عمر کے لیے کچھ اندوختہ موجود تھا اور وہ دنیاوی جاہ و حشم بہت حد تک حاصل کر چکے تھے تو ایسے میں انھوں نے جو لکھا وہ خاص طور پر اہمیت کا حامل قرار پاتا ہے ۔ ان ناولوں میں ابن الوقت مخصوص وجوہ پر برابر توجہ کا مستحق رہا لیکن باقی ناول خاص طور پر ایامیٰ نظر انداز کر دیے گئے۔ حالانکہ یہ ناول نذیر احمد کو محض ایک مصلح سے زیادہ ایک سماجی ناقد ثابت کرتے ہیں بالکل اپنے وقت کے اعتبار سے منٹو اور میرا جی کی طرح۔ نذیر احمد کو مصلح قرار دینا یا ان کے ناولوں کو اصلاحی ناول کہنا ایک عمومی غلط فہمی کا نتیجہ ہے جس کا اوّلین پرچار ،نذیر احمد کے ابتدائی ناقدین کے مستقل اصرار سے ہوا۔ ولیم میور اور کیمپسن جیسے ناقدین نے نذیر احمد کو اصلاح کا ایسا علم تھمایا کہ آج تک اس کی پھڑ پھڑاہٹ کہیں نہ کہیں سنائی دے جاتی ہے۔ دوسری طرف ناولوں کے دیباچوں میں بطور مصنف اور ناول کے بیانیے میں بطور راوی ان کی شمولیت بھی اس احساس کو توانا کرنے میں خاصی کارفرما رہی ہے۔ اگر نذیر احمد کے بارے نقادوں کی آرا، ان کے دیباچوں اور بطور راوی ان کی شمولیت سے صرف نظر کر کے براہ راست ناول کے کرداروں سے واسطہ پیدا کیا جائے تو نذیر احمد ایک مصلح سے زیادہ حساس سماجی ناقد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ نذیر احمد کے وہ کردار جو بظاہر ناکام اور دھتکارے ہوئے ہیں، مئوثر طور پر جاندار اور طاقتور محسوس ہوتے ہیں جبکہ اصلاح کے علمبردار کردار بے جان، یک رخے اور پھسپھسے ہیں۔

خاص طور پر ایامیٰ اس سلسلے کا اہم ترین ناول ہے۔ ایامیٰ میں پہلی مرتبہ قاری نذیر احمد کے سماجی شعور سے واقفیت پیدا کرتا ہے۔ یوں تو ابن الوقت میں بھی نذیر احمد کے ان خیالات کا عکس موجود ہے جو وہ اپنے لیکچرز میں گاہے گاہے بیان کرتے رہے لیکن ایامیٰ میں آزادی بیگم کی صورت ہم اس عورت سے ملتے ہیں جو جدید اور قدیم کے سنگم پہ کھڑی ہوئی عورت ہے۔ یہاں ڈپٹی صاحب کا معاشرہ بھی نگاہ میں آتا ہے کہ یہ معاشرہ بھی جدید اور قدیم کے سنگم پہ کھڑا ہوا معاشرہ ہے۔ نذیر احمد کے ذہنی رویے کے تناظر میں ایامیٰ کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ یہ ناول کبھی نصاب کا حصہ نہیں رہا، شاید یہ وہ پہلا ناول ہے جو نذیر احمد نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں لکھا۔ یہ کبھی انعامی سلسلے میں پیش بھی نہیں کیا گیا۔ شاید اس ناول کے نظر انداز ہونے کی وجوہات میں مندرجہ بالا عوامل کا بھی حصہ ہو، پھر یہ بھی ہے کہ یہ ناول نذیر احمد کی تخلیقی زندگی کے آخری ایام کی پیشکش ہے تو اس

ناول کا بطور خاص تجزیہ نذیر احمد کی تخلیقی شخصیت کے نئے زاویے سامنے لانے کا سبب بن سکتا ہے۔

اصغری اور آزادی دو بالکل مختلف عورتیں ہیں۔اصغری اپنے شوہر کی کامیابی کی خواہاں ہے کیوں کہ شوہر کے سماجی رتبے سے اس کا رتبہ جڑا ہوا ہے اور ایہ واحد ناول ہے کہ جس میں آزادی بیگم شادی کے لیے تیار نہیں اور اگر شادی ضروری ہے تو وہ اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔اس کی طویل خود کلامیاں اس کی ذہنی کشاکش کا پتا دیتی ہیں اور ناول کے ابتدا میں مصنف کی رائے ہمیں بہت صائب محسوس ہونے لگتی ہے کہ آزادی بیگم ایک انوکھی لڑکی ہے۔وہ ایسے خاندان میں پیدا ہوئی جس میں لڑکیوں کا توڑا ہے۔اس کے لیے چھٹی،عقیقے اور مونڈن تو کیا سالگرہ نمک چشمی مورونڈے اور جو تقریبیں بعد کو ہوا کرتی ہیں اور جو صرف لڑکوں سے مخصوص ہیں وہ سب ہوئیں۔وہ ایسی تندرست ہے کہ کوئی مرد بھی کیا ہوگا (یعنی جسمانی طاقت میں بھی کسی سے کم نہیں) اس کی تربیت دو مخالف قوتوں کی کشمکش میں ہوئی۔باپ جو مشن کالج میں انگریزی تعلیم پا چکا ہے اور ماں جو روایت پرست ہے۔یاد رہے کہ آخیر میں آزادی بیگم ماں سے سخت متنفر ہو الگ گھر لے رہتی ہے اور ماں کو اپنے فیصلے بارے آگاہ کرنا بھی ضروری خیال نہیں کرتی۔اس کا جھکاؤ باپ کی طرف زیادہ ہے۔اس کا دیدہ ہوائی ہے۔سقے سے وہ نہیں چھپتی،اپلے والے سے یہ نہیں پردہ کرتی۔مردانے کے نوکروں اور سودے والوں سے یہ بات کرتی ہے۔بولتی ہے تو اس قدر چلا کر کہ گلی میں آواز صاف سنائی دیتی ہے۔پادری کی بیٹی سے اس کی دوستی ہے۔یہاں تک کہ بیماری ہی کی وجہ سے لیکن ایسی دوا استعمال کرتی ہے کہ جس میں شراب کی روح ہے۔اس کے ماں باپ میں دن رات کم عمری کی شادی پر حجت رہا کرتی ہے۔اور آزادی بیگم کا خیال ہے کہ:

> ''۔۔۔میں تو بیاہ کے نام سے گھبراتی ہوں۔کم عقل لڑکیوں کو دلہن بننے کی ۔۔۔خوشی۔۔۔رہتی ہو گی۔۔۔میاں کی بد مزاجی،ساس نندوں کے طعنے،بچوں کا جننا،خانہ داری کے بکھیڑے ایک مصیبت ہے۔۔۔کم بخت یہ پیٹ سارے جتن کراتا ہے۔عورتیں نکمی بے ہنر کچھ کمائی تو کر نہیں سکتیں۔مردوں کا سہارا نہ پکڑیں تو کھائیں کہاں سے۔''[۱۰]

یہ اور بات ہے کہ رسم و رواج کی پابند آزادی کی ماں اتنی طاقتور ثابت ہوتی ہے کی آزادی اس سے کچھ بھی نہیں کہ پاتی اور آزادی تو کجا،اس کا جدت پسند باپ بھی چیں نہیں بول پاتا۔آزادی نہ اپنے خاندان کے مردوں کی طرح مدرسے میں تعلیم پاتی ہے نہ شادی کے بارے اس کے خیالات کوئی بار پاتے ہیں۔بالآخر وہ ماں کی پسند سے اس کے خاندان میں مولوں کے ہاں بیاہی جاتی ہے۔لیکن آزادی کی آزادی پسند طبیعت اس کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی اور وہ اپنے شوہر کو مولویت سے نکال کر انگریزی نوکری پر آمادہ کر ہی لیتی ہے۔یوں تو اصغری بھی اپنے شوہر کی نوکری اور معاشی خوشحالی کا سبب بنتی ہے لیکن اس سلسلے میں اسے اپنے خاندان کی پوری حمایت اور مدد حاصل ہے جبکہ آزادی مولویت کو پسند نہیں کرتی اور وہ سسرال کی مخالفت کے باوجود اپنے شوہر کو مذہب کے کاروبار سے باہر نکالنا چاہتی ہے۔کہانی میں ایک ڈرامائی موڑ اس وقت آتا ہے جب مولوی مستجاب کی موت واقع ہوتی ہے۔کون کہ سکتا ہے کہ مولوی کامل کا اگر انتقال ہو جاتا تو اصغری کی کیفیت اور رتبے میں کیا فرق پڑتا لیکن آزادی بیگم کی کہانی تو درحقیقت شروع ہی اس وقت ہوتی ہے جب مولوی مستجاب پردیس میں مر جاتا ہے۔مستجاب صرف آزادی کا شوہر ہی نہیں محبوب بھی ہے۔اس کے شوہر کی موت کا تار گھرانے یا پاس پڑوس کے کسی مرد کی بجائے آزادی بیگم کے

نام آتا ہے جس پر کنبے والے حیرت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ یہ بھی آزادی بیگم کے انوکھے ہونے کی نشانی ہے۔اور وہ جو ڈپٹی صاحب نے آزادی کے تعارف ہی میں لکھا ''پس آزادی نہ صرف اکیلی بیٹی تھی بلکہ اکیلی پوتی اکیلی نواسی اکیلی بھانجی اکیلی بھتیجی''[۱۱] تو وہ واقعی اکیلی عورت ہی ثابت ہوتی ہے۔اس معاشرے میں ایسی عورتیں خال خال ہی ہوسکتی تھیں جو شادی کو معاشی مسائل کا حل تصور کرنے کی بجائے جسمانی تقاضے پورے کرنے کا طریقہ تصور کریں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ انوکھی عورت بھی ناول اور اپنی زندگی کے آخیر میں مردوں سے ایک فکر انگیز خطاب کے سوا اور مر جانے کے سوا اور کوئی بغاوت نہ کر سکی۔نذیر کی آزادی بیگم کو منٹو کے افسانوں میں ظہور کرنے کے لیے تقریباً نصف صدی تک انتظار کرنا پڑا۔مزے کی بات یہ ہے کہ اس ناول کا راوی، جو باقی کے ناولوں میں مصلح کے طور پر سامنے آتا ہے، اس بات پر نوحہ کناں ہے کہ آزادی کچھ عملی اقدام کیے بغیر اپنی عمر اخیر کر گئی۔ یوں قاری دیکھتا ہے کہ یہاں راوی بھی اپنے تحفظات سے بے پرواہ ہو کر آزادی بیگم کی حقیقی آزادی کا خواہاں ہے جو اس وقت نہ سہی، آئندہ برسوں میں بہت حد تک اسے مل کر رہی۔

عورتوں کی تعلیم اور انھیں معاشرے کا ایک مفید فرد بنانا، مراۃ العروس سے ہی نذیر احمد کے ناولوں کا ایک بنیادی مقصد رہا ہے۔اس کی ایک وجہ تو وہی ہوسکتی ہے کہ انگریز حکومت کی خاص توجہ عورتوں کی تعلیم کی طرف تھی اور مفید کتابوں میں ایسی کتابیں بھی شامل کی جا سکتی تھیں جن کا مقصد عورتوں کو تعلیم دینا ہو، لیکن نذیر احمد ''اصلاح پسندی'' کے جوش کے باوجود 'ایامیٰ' سے پہلے عورتوں کی تعلیم کے لیے کشمکش کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ان کے نزدیک عورتوں کی تعلیم ضروری ہے لیکن ایک خاص حد تک، مخصوص مقاصد کے تحت اور سنسرڈ۔

ایامیٰ سے پہلے عورت کی تعلیم کا نوکری یا معاشی ضرورت سے کوئی تعلق اگر ہے، تو صرف اس حد تک کہ مرد کی کمائی کو بہتر طریقے سے استعمال میں لا سکے۔بچوں کی پرورش بہتر انداز میں کر سکے۔ بلکہ جب حسن آرا کی تعلیم کے لیے اکبری کا نام زیر غور آتا ہے تو کہنے والوں کو نوکری گیری کا کہنے میں تامل ہوتا ہے۔عورتوں کے لیے سنسرڈ تعلیم کا اعلان بھی نصوح کے ذریعے ہوتا ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انیسویں صدی میں جو رسالے عورتوں کے لیے نکالے جا رہے تھے مثلاً عصمت، ان کے ایڈیٹر زیادہ تر مرد ہوتے تھے تاکہ وہ اپنے خیال کے مطابق مناسب اور موزوں معلومات عورتوں تک پہنچا سکیں۔اس زمانے کے مروجہ خیال کے مطابق (اور بہت حد تک آج بھی) برصغیر کے معاشرتی نظام میں خاتون خانہ کو اہمیت دی جاتی ہے اور پڑھی لکھی اور نوکری پیشہ عورت کے بارے میں عمومی نظریہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی عورت شمع محفل بن جاتی ہے۔

مستجاب کے مرنے سے آزادی کو معاشی دھچکہ نہیں لگتا کہ وہ دوبارہ شادی کے لیے مجبور ہو جائے۔خیر سے اس کی ماں بھی اسے تمام عمر گھر بٹھا کے کھلانے کو تیار ہے۔ادھر بھوپال کے نواب صاحب نے بھی تیس روپے مہینہ کا وظیفہ لگا دیا ہے جب تک کہ دوسرا نکاح نہ کرے۔ بال بچے کی کوئی ذمہ داری سر پر نہیں ہے۔تیس روپے اکیلی جان کو کیا کم ہیں، لیکن آزادی بیگم کے لیے بیوگی کی زندگی قابل قبول نہیں۔اسے بیوہ کی طرف معاشرے کا رویہ بھی برا لگتا ہے۔اگرچہ اس کو مولوی مستجاب سے بہت محبت رہی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو گھلا دینے کی قائل نہیں۔وہ رانڈ ہو کر بھی پھول چوڑیاں پہننا چاہتی ہے۔آرائش و زیبائش کی خواہاں ہے اور خود مختار زندگی بسر کرنے کے لیے ایک روز چپکے سے ماں کا گھر چھوڑ کر نکل آتی ہے۔ایسی خود معاملہ اور خود شناس عورت فسانۂ مبتلا کی ہریالی بھی ہے لیکن ہریالی مروجہ معیارات زمانہ کے مطابق ایک شریف عورت نہیں بلکہ خانگی ہے۔اور مبتلا کو

چھوڑ کے چلے جانا اس کی خودمختاری کا اعلان نہیں بلکہ اس کی رذیل نسل کا شاخسانہ ہے،لیکن آزادی بیگم اگر ایک مرد کے نہ رہنے پر دوسری شادی کی خواہش پالتی ہے تو یہ بطور تہمت نہیں، بطور انسان اس کی جبلت کا تقاضا ہے، یوں نذیر احمد انسانی نفسیات کے پارکھ محسوس ہونے لگتے ہیں۔

تکنیک کے اعتبار سے بھی یہ ناول ڈپٹی صاحب کے اہم ترین ناولوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ پورا ناول خودکلامی کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ڈپٹی صاحب نے ایامیٰ اور رویائے صادقہ میں دو تکنیکیں برتی ہیں،خودکلامی اور خواب کی تکنیک جو معاصر ادب میں شاہکار فن پارے کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں ،خاص طور پر جیمز جوئیس کو کون بھول سکتا ہے جس کا اہم ترین کام ان دو تکنیکوں ہی کی مرہون منت رہا ہے۔افتخار احمد صدیقی نے بجا طور پر لکھا ہے۔

''غالبا اُردو میں یہ پہلا ناول ہے جس کا پلاٹ واقعات کے بجائے کرداروں کے خیالات اور محسوسات کے تانے بانے سے بنا گیا ہے۔''[۱۲]

یوں ڈپٹی نذیر احمد کے معاملے میں بالخصوص اور اس تبدیلی پر آمادہ معاشرے کے تناظر میں بالخصوص ایامیٰ کا تفصیلی مطالعہ خاص اہمیت کا حامل ٹھہرتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی:

۱۔ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد۔مرتب سلیم اختر ڈاکٹر،لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء

۲۔ مولوی نذیر احمد دہلوی۔احوال وآثار،افتخار احمد صدیقی،لاہور،مجلس ترقی ءادب،نومبر ۱۹۷۱ء،ص ۴۵۱

۳۔ ایامیٰ،مرتبہ سفینہ،دہلی،عرشیہ پبلی کیشنز۔س۔ن ،ص ۴۲

۴۔ اس نسخے کو بنیاد بنا کر ایامیٰ کی ترتیب واشاعت کا کام جاری ہے۔اس مضمون کے لیے بھی اسی نسخے کو استعمال کیا گیا ہے۔

۵۔ ایامیٰ،ڈپٹی نذیر احمد،آگرہ،مطبع شمسی،س۔ن ص اول

۶۔ افتخار احمد صدیقی۔ص ۳۶۱

۷۔ گارساں دتاسی:''خطبات گارساں دتاسی'' بحوالہ افتخار احمد صدیقی۔ص ۳۱۸

۸۔ ایضا

۹۔ محمد نعیم، چودھری: نذیر احمد کا انعامی ادب،مشمولہ آج،شمارہ ۲۶،دسمبر ۱۹۹۸،ص ۲۲۰۔۲۱۹

۱۰۔ ایامیٰ۔ص ۲۵،۲۶

۱۱۔ ایامیٰ،ص ۳

۱۲۔ افتخار احمد صدیقی۔ص ۳۷۳